"ٹیڑھی لکیر" میں عصمت چغتائی کی تانیثی جہات کا تجزیاتی مطالعہ

An Analytical Study of the Feminine Dimensions of Ismat Chughtai in "Terhi Lakeer"

[i] سکینہ صدیق [ii] ڈاکٹر رخشندہ مراد

Abstract:

Ismat Chughtai was a famous progressive Urdu writer. She is considered as one of the four pillars of modern Urdu writing along with Saadat Hassan Manto, Rajinder Singh Badi and Krishan Chander. She enlightened the concept of feminism ,female sexuality and emotional desires of females. She has also highlighted the miserable condition of females and their problems living in the Sub Continent. This research will be focused under her auto biographical novel "Terhi Lakeer"

Keywords: *Urdu Novel, Autobiography, Politics, Patriarchy, Feudalism, Feudalism, Capitalism, Colonialism, Homosexuality, Psychology, Resistance, Class Struggle.*

عصمت چغتائی اردو کی ایک مشہور ترقی پسند مصنفہ تھیں .انھیں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے ساتھ جدید اردو فکشن کے چار ستونوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے .انھوں نے حقوق نسواں، خواتین کی جنسیت اور خواتین کی جذباتی خواہشات کو روشن کیا۔ اس نے برصغیر میں رہنے والی خواتین کی ابتر حالت اور ان کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ تحقیق ان کے سوانحی ناول "ٹیڑھی لکیر" کے تحت کی جائے گی۔

کلیدی الفاظ: اردو ناول ، سوانحی ناول ، خود نوشت ادب ، سیاست ، پدرسری نظام تانیثیت ، جاگیردارانہ نظام ، سرمایہ دارانہ نظام ، نوآبادیاتی نظام ، ہم جنس پرستی ، نفسیات ، مزاحمت ، طبقاتی کشمکش۔

عورت کسی بھی معاشرے کا اہم فرد ہے جس کی حالت زار ہر زمانے میں کروٹیں بدلتی رہی۔ ہماری تہذیب کے آغاز میں مدرسری دور تھا جس میں عورت کو خاص مقام حاصل تھا۔ وہ آزاد اور خود مختار زندگی گزر رہی تھی۔ کھیتی باڑی اور گھریلو فرائض خود سرانجام دیتی تھی جنسی ملاپ کے لحاظ سے اس پر کوئی پابندی نہیں تھی جس سے چاہتی اپنا تعلق استوار کر لیتی۔ انسانی تہذیب کے ارتقا اور سائنسی ایجادات نے زراعت کے نئے آلات سے متعارف کروایا مردوں نے ان آلات کو چلانے کی مہارت حاصل کر کے زراعت کا کام خود کرنا شروع کر دیا اور اپنی مالی حیثیت بہتر کرنے کے لیے بھیڑ بکریاں اور غلام بھی رکھ لیے۔ اس نے آہستہ آہستہ عورت کو بھی اپنی ملکیت کی شے کے طور پر تسلیم کر لیا اور زر خرید غلاموں کی طرح عورت کے ساتھ بھی بدسلوکی شروع کر دی۔ مدرسری سے نظام پدرسری کی طرف بدل گیا جو عورت کی بہت بڑی

[i] پی ایچ ڈی اُردو اسکالر، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد (Corresponding Author)
[ii] اسسٹنٹ پروفیسر، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

شکست تھی۔ پدرسری نظام نے عورت کو غلامانہ ذہنیت کا مالک بنا دیا۔ سخت محنت کرنے کے باوجود وہ معاشرے میں مردوں کے برابر مقام حاصل نہ کر سکی۔ تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں عورت نے معاشرے کی تہذیب و تمدن میں مرد کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اخلاق ہو یا زبان و بیان، تجارت ہو یا صنعت و حرفت، مذہب ہو یا سیاست، عہد امن و امان ہو یا جنگ عورت نے ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ بد قسمتی سے پدرسری سوچ کے تحت پروان چڑھنے والے معاشرے نے ہر جگہ اپنی تنگ نظری کے باعث عورت کا استحصال کیا ہے۔ یہ ہی نظام بعد میں آنے والے کسی بھی تہذیب اور معاشرے پر لاگو ہوا بلکہ اس نے عورت کو بنیادی حقوق بھی نہیں دینے دیے۔ عورت کے ساتھ پدرسری معاشرے کی سیاست جوڑ گئی جس نے بڑی چالاکی سے معاشرے کی بڑی طاقتوں کو عورت کے خلاف استعمال کیا جن میں مذہبی اور سیاسی ادارے شامل ہیں۔ یہ ہی نظام ہمارے معاشرے کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا جس سے آقا اور غلام کا رشتہ استوار ہوا۔ طبقاتی نظام کے تحت مرد حاکم اور عورت کو محکوم قرار دیا گیا جب کہ دوسری طرف خاندان کسی بھی معاشرے کی بنیادی اکائی ہوتے ہیں اور تو اور خاندانی نظام میں بھی طبقاتی ناہمواری چھوٹے، بڑے، مالک، نوکر، میاں بیوی کی صورت میں پیدا دی کی گئی چھوٹے بڑوں کا احترام کرتے ہیں تو نوکر مالک کی ہر بات کو حکم خداوندی کا درجہ دیتے ہیں بیوی شوہر کی ہر اچھے برے کام میں اطاعت کرتی ہے۔ طبقاتی ناہمواری نے معاشرے میں نفرت کی جڑیں پوست کر دیں جس کو ختم کرنے کے لیے ادیبوں نے معاشرے میں تخلیقات کا سہارا لیا۔ ان ہی ادیبوں میں عصمت چغتائی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ عصمت چغتائی کا تعلق ترقی پسند تحریک سے ہے اسی وجہ عصمت چغتائی کو طبقاتی تقسیم سے نفرت تھی جو ایک جیسے انسانوں میں آقا اور غلام کے درمیان تفریق پیدا کرتی ہے۔ مجبور اور بے بس لوگوں کو اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہر حلال اور حرام طریقے کو استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے اس لیے عصمت چغتائی نے اس نظام سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی "کاغذی ہے پیراہن" میں لکھا ہے:

> "میری محدود دنیا میں طبقاتی تفریق نوکر اور آقا کے رشتہ میں نظر آئی، اس نے مجھے متاثر کیا جب کہ باقی کی وسیع دنیا سے سابقہ پڑا تو پتا چلا اونچ نیچ ذات پات صرف ڈھونگ ہے اصل چیز امیر غریب ہے۔"(۱)

عصمت چغتائی نے مزدوروں اور نچلے طبقے کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔ اسی طبقے میں عورتیں بھی شامل تھیں کیوں کہ پدرسری نظام کی سیاست نے عورت کا ہر جگہ استحصال کیا جاگیردارانہ نظام ہو یا سرمایہ دارانہ نظام۔ جاگیردارانہ نظام نے عورت کو چادر اور چار دیواری میں بند کر کے غلامانہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تو دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام نے عورت کو ایک شے اور کموڈیٹی کے طور پر متعارف کروایا اور اپنے کاروبار کو ترقی دینے کے لیے عورت کو اشتہار کے طور پر استعمال کیا۔ اس کو چھوٹے چھوٹے عہدوں پر نافذ کیا تاکہ وہ معاشرے میں مردوں کے برابر مقام حاصل نہ کر سکیں ہر شعبے میں مرد کو اعلیٰ مقام اور عورت کو دوسرا درجہ دیا گیا: جیسے مرد ڈاکٹر ہے تو عورت نرس، مرد افسر ہے تو عورت سیکریٹری، مرد پائلٹ ہے تو عورت ائیر ہوسٹس۔ اس طرح کی متعدد مثالیں موجود ہیں جہاں پر عورتوں کو کم تر درجہ دیا گیا ہے اور مرد کو اعلیٰ۔ عورت کو ثانوی حیثیت صرف گھروں میں ہی نہیں بلکہ عوامی جگہوں اور دفتروں میں بھی دی گئی۔ ان ہی مظالم کو روکنے کے لیے تانیثی تحریک وجود میں آئی جس نے صنفی اور جنسی برابری کا مطالبہ کیا۔ اس تحریک کا آغاز اگرچہ فرانس میں ہوا مگر جلد ہی اس نے اپنے اعلیٰ مقاصد کے تحت دنیا کے ہر ملک میں اپنے آپ کو منوالیا۔ اس تحریک نے ہر علاقے اور ملک میں جداگانہ انداز اپنایا جس کی وجہ وہاں کی جداگانہ تہذیب و ثقافت تھی۔ یہ بہت وسیع اصطلاح ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جا سکتے بلکہ یہ کثیر المعنی تصور ہے جس میں مختلف ایشوز اور رویے شامل ہیں۔ عورت کی انسانی حیثیت کو پہچاننے، معاشرے میں اس کی تکمیل میں رکاوٹیں ڈالنے والی روایت کو سمجھنے اور اس کے خلاف عملی اقدام اٹھانے کا نام ہی تانیثیت ہے۔ اسی نسائی شعور نے انسانی شعور کی بنیاد رکھی کیوں کہ عورت کی بنیادی حیثیت سے انکار غیر انسانی بات ہے، اسی لیے فاطمہ حسن نے تانیثیت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

> ''فیمنزم اس احساس کا نام ہے کہ معاشرے میں عورت مظلوم ہے اور اس کا استحصال کیا جاتا ہے اور اس صورت حال کو بدلنے کی شعوری کوشش کا نام ہے۔''(۲)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب کسی بھی معاشرے کا بہترین عکاس ہوتا ہے اس کو تخلیق کرنے والے ادیب حساس طبیعت کے مالک ہیں جو معاشرتی ناہمواریوں کو اپنا موضوع ہی نہیں بناتے بلکہ ان کے خلاف بھی آواز اٹھاتے ہیں۔ بہت سے ادیبوں نے عورت کی زبوں حالی کو اپنا موضوع بنایا مگر

شروع میں ان کی آواز دھیمی، مدھم اور دبی دبی تھی۔ اردو ادب میں تانیثی تحریک کا باقاعدہ آغاز ترقی پسند تحریک سے ہوا۔ جس کی پہلی نسائی آواز رشید جہاں کی تھی جنھوں نے انگارے کی اشاعت میں دو افسانے تحریر کیے۔ ان افسانوں میں فحاشی تو نہ تھی البتہ اس دور میں کسی عورت کے افسانوں کا اصل نام سے شائع ہونا ضرور معیوب بات تھی۔ رشید جہاں نے اپنے افسانوں میں عورت کے ساتھ کیے جانے والے فرسودہ اور استحصالی طرز عمل کے خلاف جہاد کیا عصمت چغتائی نے رشید جہاں کے فکر کو نہ صرف پسند کیا بلکہ ایک آئیڈیل تصور کے طور پر اپنایا اور آج سے ساٹھ سال پہلے جو کچھ لکھا آج کی آزاد عورت کے لیے لکھنا ابھی بھی محال ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنی بغاوت کا آغاز گھر سے کیا اور گھریلو علمی تعلیمی کے تحت لڑکیوں کو ڈرائے جانے والے پدرسری حربوں کو ناکام بنایا اس کے بعد جہاں بھی اسے عورت کے ساتھ ناانصافی ہوتی نظر آئی انھوں نے آواز بلند کی۔ ان کی بغاوت میں مرضی سے زندگی گزارنے کی روش نظر آتی ہے وہ خود کو باغی عورت ضرور تصور کرتی ہیں مگر اپنے باغی پن کو معیوب قرار نہیں دیتیں۔ ان کا دور سماجی اور ادبی انقلاب کا دور تھا جس میں عورت کی حالت زار قابل رحم تھی اس دور میں عورت گھر کی چار دیواری میں بند تھی جس کا گھر سے باہر نکلنا برا سمجھا جاتا تھا۔ رسمی تعلیم کا کوئی رجحان نہ تھا کم عمری کی شادی کا رجحان عام تھا جو بچپن سے ہی طے کر دی جاتی تھی شوہر کے مرنے پر بیوی کو بھی ساتھ ہی ستی کیا جاتا تھا پردے کے بغیر کوئی عورت گھر سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ نوآبادیاتی دور میں عورت مشرقی اور مغربی اقدار کے سنگم پر کھڑی تھی۔ جو گھریلو ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ آنے والے وقت کے تقاضوں کو بھی نظر رکھے ہوئے تھی۔ نوآبادیاتی نظام کے تحت فاتح قوم کے اثرات شکستہ قوم پر اثرانداز ہوئے۔ انگریزوں کے آنے سے مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں نے بھی مشنری سکولوں میں پڑھنا شروع کر دیا۔ تعلیمی طور پر عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے گئے مگر گھریلو علمی معاملات میں عورت کی محکومیت ویسی کی ویسی قائم رہی۔ معاشرتی طور پر بہت سی تبدیلی رونما ہوئیں بہت سے انگریزوں نے مسلمان لڑکیوں سے شادیاں کیں اور مسلمانوں نے انگریز عورتوں کو اپنے بستر کی زینت بنایا۔ عورتوں کے لیے تعلیمی ادارے بنائے گئے۔ ایسے حالات میں عورت کی آواز کو عصمت چغتائی نے اپنی تخلیقات کی صورت میں قلم بند کیا۔ عصمت چغتائی نے اپنے ناول اور افسانوں میں متوسط طبقے کی عورتوں کی زبوں حالی کو اپنا موضوع بنایا ان کو نفسیات سے خاص لگاؤ تھا وہ

فرائیڈ کے اس نظریے کی حامی ہیں کہ انسان کی شخصیت پر سب سے زیادہ اثرانداز ہونے والا پہلو جنسی پہلو ہے اس لیے وہ ہر جگہ اور ہر کردار میں اسی پہلو کو کریدتی نظر آتی ہیں اسی جنسی کج روی کی روش ان کو فحش نگاری کی دلدل میں بھی پھنسا دیتی ہے انقلابی ذہن کی مالک ہونے کی بناء پر وہ برصغیر کی عورتوں کو بھی اسی سوچ کا حامل بننا چاہتی ہیں۔ عصمت چغتائی نے اپنی تخلیقات میں جاگیردارانہ نظام کی غلامانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ دور کی عورت کا نقشہ پیش کیا جس کو مختلف قسم کی فرسودہ اور غیر مذہبی روایات میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا عصمت چغتائی نے ان روایات سے نہ صرف خود انحراف کیا بلکہ معاشرے کی دوسری عورتوں کو بھی اس کے خلاف اکسایا۔ ڈاکٹر ثروت جہاں اپنے مقالے "خواتین ناول نگاروں کے ناولوں میں تانیثیت اور عصری مسائل کا تنقیدی جائزہ" میں عصمت چغتائی اور قرۃالعین حیدر کی فکشن نگاری کو تانیثی ادب کا باقاعدہ آغاز قرار دیا۔

دوسری اصناف ادب کی نسبت سوانحی ناول میں مصنف کی ذاتی زندگی کی جھلک زیادہ نمایاں ہوتی ہے کیوں کہ اس کے کردار حقیقی ہوتے ہیں جن کو افسانوی رنگ دیا جاتا ہے۔ یورپ کے نشاۃثانیہ کے بعد سوانحی ناولوں کا رجحان نمو پایا جس کی جھلک اردو ادب میں ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی"، قرۃالعین حیدر کا "کارجہاں دراز" اور عصمت چغتائی کا "ٹیڑھی لکیر" میں نظر آتی ہے۔ عصمت چغتائی کے دور میں اردو ناول اصلاحی تمدن کی نیک خواہش سے آگے بڑھتا نظر نہیں آتا۔ عصمت چغتائی نے پہلی دفعہ عورت کی فطرت، اس کی نفسیات، اس کے احساسات وجذبات کی دینا کو حقیقی نظر سے دیکھا اس نے وہ تمام باتیں اپنے کرداروں کا حصہ بنائیں جو کنواریاں، بیاہیاں سرگوشیوں میں کرتے ہوئے شرماتی ہیں۔ انھوں نے مرد اور عورت کی برابری کو فکر کی برابری قرار دیا۔ اسی دور میں جنس کو صرف وارث پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ ہنری اور برنارڈشا عصمت چغتائی کے پسندیدہ مصنفین تھے اس لیے عصمت چغتائی نے جارج برنارڈشا کے نظریے کی حمایت کرتے ہوئے عورت کو ایک شکاری قرار دیا جو اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے مناسب مرد تلاش کرتی ہے اور اپنے گھر میں پرامن کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ عصمت چغتائی کا سوانحی ناول ٹیڑھی لکیر ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا جس کو دس بہترین ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اور عصمت چغتائی کے ناولوں میں اولین درجے کا حق دار قرار پایا۔ دوسرے معیاری ناولوں کی طرح اس کا ترجمہ بھی طاہر نقوی نے انگریزی

زبان میں کیا۔اس ناول کی تین منزلیں اور اکتالیس ابواب ہیں۔ پوری کہانی تین حصوں پر مشتمل ہے جس کا مرکزی کردار شمن ہے۔ پہلے حصے میں شمن کا بچپن، دوسرے حصے میں جوانی کا ابتدائی حصہ اور بورڈنگ سکول کے حالات اور تیسرے حصے میں شمن کا خارجی دنیا سے ٹکراؤ دکھایا گیا ہے۔ یہ پہلا نفسیاتی ناول ہے جس میں متوسط طبقے کی نوعمر لڑکیوں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پوری کہانی سماجی و نفسیاتی کردار شمن کے گرد گھومتی ہے۔ جو اپنے والدین کی دسویں اولاد تھی زیادہ بیٹیوں کے ہونے کی وجہ سے بد بختی نے ان کے گھر کا رستہ دیکھ لیا تھا اس دور میں لڑکیوں کی پیدائش کو معیوب سمجھا جاتا تھا دوسری طرف زیادہ بہن بھائی ہونے کی وجہ سے ماں بچوں کی طرف توجہ نہیں دے سکتی تھی دوسرے بہن بھائی سب نابالغ تھے لہٰذا کوئی بھی اس بچی پر توجہ نہیں دیتا تھا اس لیے شمن کے کردار کے اندر شروع سے ہی بغاوت تھی جو آزاد اور روشن خیال لڑکی کی علامت تھی شمن کا کردار خود عصمت چغتائی کا اپنا کردار ہی تھا جس کا اعتراف وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں :

> ''ٹیڑھی لکیر میری آپ بیتی ہے مجھے خود آپ بیتی لگتی ہے۔ میں نے خود اس ناول کو لکھتے ہوئے بہت محسوس کیا۔ میں نے شمن کے دل میں اترنے کی کوشش کی۔'' (۳)

عصمت چغتائی نے بچپن کا دور اپنا بیان کیا جب کہ جوانی کے دور میں نوآبادیاتی نظام کے تحت آنے والے سرمایہ دارانہ نظام کی جھلک نظر آتی ہے جس میں شمن کے ساتھ منسلک مختلف مرد کردار اپنے ارد گرد کی لڑکیوں کی زندگی سے لیے ہیں۔ اس دور میں عورت کا عورت ہونا ہی معیوب سمجھا جاتا تھا مرد کیوں کہ معاشرے کے نظام کو مکمل طور پر کنٹرول کیے ہوئے تھا اس لیے وہ اپنی فوقیت قائم رکھنے کے لیے عورت کا استحصال کرتا رہا جس کی نوعیت ہر طرف مختلف اشکال میں نظر آتی ہے۔ عورت کو اپنے ذاتی تشخص بننے اور ظاہر کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ مشہور خواتین ادباء اپنی تخلیقات کو اپنے نام سے نہ لکھ سکیں۔ ادبی لحاظ سے دیکھا جائے تو ادبی تاریخ میں عورت کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے کیوں کہ کتنی ہی باصلاحیت خواتین گم نامی کے پردے میں گم ہو گئیں۔ ان کی انفرادی صلاحیتوں سے انکار کا ایک پہلو ان کی تخلیقات کا مردوں کے نام سے شائع ہونا بھی تھا۔ شروع میں عصمت چغتائی بھی اپنی تحریریں اپنے بھائی کے نام سے شائع کرواتی تھیں تاکہ ان تحریروں کو بھی مرد ادیبوں کے مساوی درجہ ملے اور کسی کو اعتراض نہ ہو کہ کسی عورت میں بھی جرات اظہار پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے دور میں ٹیڑھی لکیر جیسا ناول لکھنا کانٹوں پر چلنے کے مترادف تھا۔ یہ

ایک سوانحی ناول ہے جو خود نوشت کی ایک شکل ہے خود نوشت کو ڈاکٹر وہاج الدین نے اپنی ذات سے تصادم کا نام دیا ہے۔

عصمت چغتائی کے فن کا بنیادی عنصر سچائی ہے اور سچائی کے اظہار کے لیے حقیقت نگاری کی ضرورت پڑتی ہے اس پورے سوانحی ناول میں عصمت چغتائی شمن کے روپ میں اپنی ذاتی کشمکش کو مختلف زاویوں سے بیان کرتی ہے جس کا اظہار وہ بڑی سچائی، جرات اور دلیری سے کرتی ہے آپ بیتی میں صرف کردہ گناہوں کا حساب پیش کیا جاتا ہے جب کہ سوانحی ناول میں ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد وصول کی جاتی ہے اگرچہ وہ مغربی عورت کی طرح کھل کر نہیں لکھ سکتی تھیں مگر اس کے باوجود اپنی باغیانہ روش کی وجہ اس حساس موضوع پر قلم اٹھایا۔ یہ ایک شمن کی کہانی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر لڑکی کی کہانی ہے جو معاشرتی پابندیوں میں باندھی ہوئی ہے اور اپنی جنسی اور نفسیاتی اُلجھنوں سے نجات پانے کے لیے ہم جنس پرستی اور عارضی سہارے تلاش کرتی ہیں۔ اس ناول میں عصمت چغتائی فرائیڈ کے نظریہ جنس سے بعض جگہوں پر انحراف کرتے ہوئے تمام حالات کا ذمہ دار ماحول کو قرار دیتی ہے خاص طور پر بچپن کے حالات و واقعات انسان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جن لڑکیوں کو گھر میں والدین کا پیار محبت اور توجہ نہیں ملتی وہ اس کو گھر سے باہر دوسرے لوگوں میں تلاش کرتی ہیں جس کے تحت وہ اپنی زندگی کے غلط فیصلے کر بیٹھتی ہیں کیوں کہ لکیر ہمیشہ سیدھی اور واضح ہوتی ہے اگر یہ ٹیڑھی ہو جائے تو تو بے حسی اور بے چینی کی علامت بن جاتی ہے۔ جس طرح عمارت کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی لگ جائے تو باقی کی عمارت کا نقشہ بھی بگڑ جاتا ہے۔ یہ ہی حال انسان کے بچپن کا ہے۔ بچوں کے اندر بچپن کی محرومیوں ساری عمر قائم رہتی ہیں جس سے بچے ضدی اور باغی بن جاتے ہیں۔ شمن کے کردار میں بھی باغی پن بچپن کی محرومیوں کی وجہ سے تھا اس ٹیڑھے پن کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہاں وہ کچھ نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا شمن اپنے والدین کی دسویں اولاد تھی ان کے گھر میں سب ہی بچے جانوروں کی طرح پل رہے تھے ماں کا کام صرف بچے پیدا کرنا تھا اور باپ کو بھی بچوں سے زیادہ بیوی سے لگاؤ تھا۔ ان سب کو پالنے پوسنے کی ذمہ داری بڑی بہن کی تھی جس کا شوق دو تین بچے پالنے کے بعد پورا ہو چکا تھا۔ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا آگرہ سے ایک انا بلالی جاتی تھیں جو ایک لاپرواا اور نو عمر لڑکی تھی۔ جس کے ایک نو عمر لڑکے سے عشق و عاشقی کے روابط تھے آخر ایک دن ان کے عشق

کی چوری پکڑی گئی اور وہ شرمندہ ہو کر خود ہی اپنے گھر واپس چلی گئی۔ گھر کے تمام بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری بڑی آپا پر ڈال دی گئی بڑی آپا تو بہن بھائیوں سے تنگ آ چکی تھیں ان سے جان چھڑوانے کے لیے بچوں کو بے جا مارتیں تھیں وہ ممتا کی محبت سے عاری تھیں اور تو اور شمن کو تو بہت مارتی تھیں جس کی وجہ سے وہ بڑی آپا سے بہت ڈرتی تھی۔ ایک دفعہ بڑی آپا نے شمن کو بہت مارا جس کی منظر کشی عصمت چغتائی نے ان الفاظ میں کی:

> "آپا سے وہ بہت ڈرتی تھی کیوں کہ ایک دن ایسی بے دردی سے مارا تھا کہ اماں تک کے آنسو نکل آئے۔" (۴)

اس رویے کا وہ بدلہ تو نہیں لے سکتی تھی البتہ زیادہ غصے میں آ کر گڑیا کی پٹائی کر دیتی اور کہنا نہیں مانتی تھی۔ ماہر نفسیات کے مطابق بچوں کی جذباتی نشوونما کا دارومدار والدین اور بچوں کے تعلقات پر منحصر ہے۔ والدین کی عدم توجہ ان کی جذباتی نشوونما کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔

منجھو آپا اس کا کسی حد تک خیال رکھتیں تھیں لیکن ان کی شادی کے بعد مزید تنہا ہو گی کچھ عرصے بعد منجھو بیوہ ہو کر گھر آ گئی اس کا رویہ اب کافی حد تک بدل چکا تھا وہ اپنی بیٹی نوری کے ساتھ شمن کا مقابلہ کرتی جس کی وجہ سے لاشعوری طور پر وہ بدل گئیں تھیں۔ گھر میں توجہ نہ ملنے کی وجہ سے شمن پڑھائی سے بے زار ہو چکی تھی گھر کا کام نہ کرنے کی وجہ سے روز سکول سے مار کھاتی۔ گھر میں کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا جس سے اس کے اندر احساس محرومی پیدا ہو گئی تھی۔ مس چرن نے ہوم ورک نہ کرنے پر شمن کو کچھ نہیں کہا وہ ان کے اس رویے سے بہت متاثر ہوئی یوں مس چرن کی تھوڑی سی توجہ نے اسے پڑھائی کی طرف مائل کر دیا۔ اب وہ مس چرن کی محبت پانے کے لیے گھر کا کام مکمل کرتی اور پوری دلجوئی سے پڑھائی کرتی تھی۔ شمن کی پڑھائی کے بارے میں عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

> "اس کا پڑھنے میں بالکل بھی زیادہ دل نہیں لگتا تھا مارے باندھے سے صرف مس چرن کی خاطر پڑھ لیتی تھی۔" (۵)

اسی محبت اور توجہ نے شمن کے لیے علم کے دروازے کھول دیئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں

کامیاب ہوئی۔ اس ناول میں مس چرن کا کردار بھی ایک معاشرتی برائی کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے مس چرن کو ہم جنس پرستی کی لت پڑ گئی تھی اس لیے شمن بھی اپنے اندر ہم جنس پرستی کی کشش محسوس کرنے لگی جو اس کا پہلا تجربہ تھا۔ مس چرن کی وجہ سے پورے ہوسٹل کا ماحول خراب ہو گیا تھا یہاں کی تمام لڑکیاں ہم جنسیت پرستی کا شکار ہوئیں سعادت نجمہ پر مارتی تھی۔ یوں پورا ہوسٹل ان مرنے والیوں پر مشتمل تھا۔ ان لڑکیوں کی حالت زار کو عصمت چغتائی ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں :

''نجمہ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے سر سے سر ملائے آخری گیت گا رہی تھی۔
وہ دونوں ایک دوسرے میں غرق دنیا سے بہت دور تھیں۔''(۶)

یونگ کے مطابق :

''بلوغ کے زمانے میں ہم جنسی لذت پرستی کا رجحان جتنا عام ہے ظاہر نہیں کیا جاتا۔''(۷)

ہم جنسیت پرستی کی بیماری معاشرتی پابندیوں اور گھٹن زدہ ماحول کی دین ہے۔ جس کا شکار شمن کی آپا منجھو بھی ہوئی تھی جس کی شادی ایک پروفیسر سے ہوئی تھی۔ پروفیسر کی ماں اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ اپنی کم عمر بہو سے لیتی تھی۔ شام کو جب اس کا بیٹا گھر آتا تو اپنی بیماریوں کے قصے سناتی اس کے بعد بیٹا جب کمرے کی طرف رخ کرتا تو بہو کو بہانے سے کام پر لگا دیتی۔ بہو صبر کی سل کلیجے پر دھرے بیٹھی رہتی۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ بیوہ ہو کر گھر آ جاتی ہے۔ اس نے اپنی تنہائی اور جنسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اپنے دیور ڈاکٹر رشید کی طرف رجوع کیا روز بیماری کا بہانہ کر کے اس کے ہسپتال میں چلی جاتی۔ ایک دن اس کا راز فاش ہو گیا اور اس کے ہسپتال جانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے بعد منجھو نے ایک بڑی مونچھوں والی عورت سے دوستی کر لی جو ہم جنسیت پرستی کی عادت میں مبتلا تھی۔ فطرت کے اصولوں کے خلاف چلنے کی ایک روش ہم جنس پرستی ہے جو مزاحمت کی ایک قسم ہے جو کسی کے ساتھ کیے جانے والے استحصالی رویے کا رد عمل ہے۔ ہم جنس پرستی ایک رویہ اور عادت ہے جو پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہم پڑ جاتی ہے جو جنسی تعلقات کے مواقع میسر آنے پر ختم ہو جاتی ہے۔ ماضی میں سلاطین اور امراء کے بعض امیر گھرانوں میں

نوخیز لڑکوں کو ان عادتوں سے بچانے کے لیے لونڈیاں فراہم کی جاتی تھیں۔ خودکاری ایک جبری فعل ہے جس کے تحت انسان ذہنی اور جسمانی طور پر لاغر ہو جاتا ہے یہاں عصمت چغتائی نے اس بیماری کا ذکر جنسی مسائل کی نشان دہی کے طور پر کیا ہے۔ اردو ادب میں ابھی تک کسی خاتون ادیب نے جنس کے فلسفیانہ اور جذباتی پہلو اتنی توجہ نہیں دی۔ مس چرن کو ہم جنس پرستی کا الزام لگا کر سکول سے فارغ کر دیا گیا اس کے بعد ایک نئی پرنسپل آئی جس کی بہن بلقیس سے اس کی دوستی ہو گئی۔ جس نے اسے اور تمام لڑکیوں کو بتایا کہ لڑکیوں کو لڑکوں پر مرنا چاہیے رات کو وہ اپنے عاشق لڑکوں کے قصے سناتی اور دن کو لڑکیاں اپنے دوست لڑکوں کی تلاش شروع کر دیتیں۔ ماحول کی خرابی سب لڑکیوں پر اثرانداز ہوتی ہے بلقیس نے شمن کی دوستی اپنے بھائی سے کروادی وہ بہانے سے شمن کو ہوسٹل سے گھر لے آتی جس سے ان دونوں کے جسمانی تعلقات بھی قائم ہو چکے تھے۔ شمن ایک بچے کی ماں بننے والی تھی کہ بلقیس کا بھائی اسے چھوڑ کر انگلینڈ چلا گیا۔ رشید کے جانے کے بعد شمن صرف تنہائی کا شکار نہیں ہوئی بلکہ اسے سخت قسم کی معاشرتی تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور نہ ہی خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ شمن کے ان حالات کو بیان کرتے ہوئے عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

> ''شمن زیادہ مرہم پٹی کی قائل نہ تھی، بڑی بے رحمی سے سب کچھ دور جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔'' (۸)

زندگی معمول کے مطابق چلتی رہی۔ عصمت چغتائی نے اس ناول کے اندر ہوسٹل کی زندگی اور اس کے مسائل کو بڑی چابک دستی سے بیان کیا ہے شمن میں بدلہ لینے کی حس بھی پائی جاتی تھی وہ جلدی کسی کو معاف نہیں کرتی تھی۔ اس کے خالہ زاد بھائی اعجاز عرف اجو نے اس کی دوست سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تو لاشعوری طور پر شمن اسے پسند کرتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ سن کر صدمے میں مبتلا ہو گئی۔ بعد میں اعجاز نے اس سے شادی کی بات چلائی تو شمن نے انکار کر کے اپنا بدلہ چکالیا۔ ایک طرف گھٹن زدہ ماحول تو دوسری طرف قسمت کی ستم ظریفی کا یہ عالم کہ وہ اپنی جائز جنسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنے باپ کے ہم عمر رائے صاحب سے عشق کے پیچے لڑاتی ہے وہ اپنی دوست پریما کے والد سے مل کر بہت متاثر ہوئی کیوں کہ وہ کھل کر بات کرتے تھے۔ باپ کا پیار نہ ملنے کی وجہ سے وہ رائے صاحب سے اظہار محبت کر بیٹھی اور یہ

کہانی ان کی وفات پر ختم ہوئی۔ کالج میں داخلہ لینا بھی اس کی زندگی کا ایک اہم ترین موڑ تھا۔ وہ سکول کے ماحول سے ایک نئی دنیا میں آ گئی تھی جس میں لڑکے اور لڑکیاں مل کر کام کرتے تھے وہ اساتذہ کے سامنے تقاریر کرتی۔ لمبے لمبے مباحث میں حصہ لیتی۔ اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے پرنسپل نے اسے یونین کی ممبر بنا دیا۔ اس نئے ماحول میں اس کو جدید طور طریقوں سے روشناس کروایا جاتا تھا لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے پردہ کرنے کی بجائے علمی مباحث میں شریک ہوتے وہ اپنے کالج کے بارے میں لکھتی ہے:

> ''نئی لڑکیوں کو یونی ورسٹی کے لڑکوں سے مہذب طریقے سے متعارف کروایا جاتا اور اس مقصد کے لیے ایک باقاعدہ دعوت ہوتی پرنسپل، استانیاں اور پروفیسر خود ہر ایک لڑکی کو ایک ایک لڑکے سے ملواتیں۔'' (۹)

اعجاز کے کالج میں پریذیڈنٹ بننے سے اس کے اندر اعتماد پیدا ہوا تھا سیتل نے اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھا دیا ان ذمہ داریوں سے اس کے اندر بغاوت کا لاوا ابل پڑا۔ کالج کے دنوں میں شمن کو باہر کی دنیا کا علم ہوتا ہے وہ سیتل کے ساتھ ہر موضوع پر لمبے لمبے مباحث میں حصہ لیتی تھی اپنے دلائل سے سیتل کو متاثر کرتی تھی ایک دفعہ اس نے کہا کیا عزت و عصمت صرف عورت کی ہوتی ہے مرد کی نہیں ہوتی؟ وہ اکثر معاشرتی بدسلوکی پر احتجاجی رویہ اختیار کرتی۔ شاید وہ اس پدرسری نظام کو بدلنے کی خواہش مند تھی۔

شمن کی تعلیم کو اہمیت دے کر عصمت چغتائی تعلیم نسواں کی حامی ہونے کا ثبوت دے رہی تھی جس نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ ایک سکول کی پرنسپل بھی بنی۔ اس سکول کی حالت ناقص تھی شمن نے دن رات ایک کر کے سکول کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ جس میں اس کی محنت رنگ لائی سکول میں مسلمان اور غیر مسلمان بچیوں کا اضافہ ہوا۔ وہ غریب بچیوں کی فیس اپنی جیب سے ادا کرتی ان کی تربیت کرنے کے لیے شمن ہر ممکن کوشش کرتی یہاں تک کہ شمن نے ان کی وجہ سے میک اپ تک کرنا چھوڑ دیا تھا۔ شمن نے اس اسکول کے اندر ایک چھوٹا سا ہاسٹل غریب طالب علم بچیوں کے لیے بنایا ہوا تھا جس میں اسکول کے کلرک کی بیٹیاں رہتیں تھیں۔ وہ عورت کو روایتی طور پر چار دیواری اور پردے کی پابندیوں میں نہیں دیکھنا چاہتی اس لیے وہ طنزاً پردے کی آزادی کو قید قرار دیتی ہیں پردے میں ہر عورت حسین نظر آتی ہے پردہ ہٹاؤ تو اصل حقیقت سامنے آتی ہے۔ شادی ایک قانونی اور معاشرتی معاہدہ ہے جس کو تجارتی اصولوں پر

استوار کیا جاتا ہے ایک طرف لڑکی کی خوب صورتی تو دوسری طرف لڑکے کی دولت کو مد نظر رکھا جاتا ہے اس لیے عصمت چغتائی کو نوری اپنی بھانجی کی شادی ایک تجارت نظر آتی ہے۔ جس میں لڑکی کی جوانی کا سودا کیا جاتا ہے پھر اسے طوائف منڈی اور شادی کی خرید وفروخت میں فرق نظر آتا ہے عام شادی میں عورت اپنے جسم کی قیمت ایک من پسند مرد سے وصول کرتی ہے یہ دل کا فیصلہ تاحیات قائم رہتا ہے اگر فیصلے کا اختیار لڑکی کو دیا جائے تو وہ خوش اور مطمئن رہتی ہے ورنہ نہیں۔ والدین اور دوسروں کی مرضی سے کیے گئے فیصلے اکثر تمام عمر مجبوراً نبھانے پڑتے ہیں۔ اسی شادی میں مراثنیں گانے میں عورت کے ساتھ کیے جانے والے استحصالی رویے کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

ہم تو بابل تودے کھونٹے کی گیاں
جدھر ہانکو ہنگ جائیں (۱۰)

ہمدردی کے نام پر دھوکہ دینے والے افتخار کا کردار جدید اور ملازمت پیشہ عورت کو خبردار کرنے کے لیے عصمت چغتائی نے ڈالا ہے۔ جو اس کی کمائی پر بیماری کا نام لے کر عیاشی کرتا ہے جس کا پول اس کی بیوی آکر کھولتی ہے اور اس کو بتاتی ہے کہ اس کے اور بھی عورتوں کے ساتھ تعلقات تھے وہ شمن کو اس کا لکھا ہوا خط دیکھا کر بلیک میل کرتی ہے اور شمن سے پیسے بٹور کر چلی جاتی ہے۔ اس واقعے سے شمن اندر سے ٹوٹ جاتی ہے اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینے کے لیے سٹے بازی بھی کرتی ہے جن میں اعجاز اور پروفیسر شامل ہیں۔ اپنی دوست ایلما سے ملاقات کے دوران اس کی جان پہچان رومانی ٹیلر سے ہو جاتی ہے جو انگریز فوج میں افسر تھا۔ نوآبادیاتی نظام کے تحت ایک ہندوستانی لڑکی شمن ایک انگریز افسر سے شادی کرتی ہے جس کی وجہ سے دونوں کو معاشرتی دباؤ کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ یہ معاشرتی دباؤ تھوڑے ہی عرصے میں نفرت کے لاوے کی صورت میں پھوٹتا ہے اور حالات سے تنگ آکر رومانی ٹیلر ہندوستان چھوڑ کر واپس چلا جاتا ہے۔ ٹیلر کے گھر چھوڑ کر جانے سے بھی عصمت چغتائی شمن کے ثابت قدم ہونے کا ثبوت دیتی ہے جو خود گھر نہیں چھوڑتی بلکہ شوہر تنگ آکر چلا جاتا ہے اگر چاہتی تو شمن اس کو چھوڑ کر ایک نیا ساتھ منتخب کر لیتی مگر اس ناول کا اختتام عصمت چغتائی شمن کے ماں بننے کی خبر سے کرتی ہے ماں کا روپ عورت کا سب سے خوبصورت روپ ہے جو تکمیل انسانیت کی دلیل ہے عصمت چغتائی کے خیال میں عورت کے تمام دکھوں کا

مدعا ماں بننے کی خوشی میں ہے۔ جو دنیا کا سب سے عظیم رشتہ ہے۔ ماں بننے کے رشتے پر ناول کو ختم کرنے کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شمن اس غلطی کو نہ دوہرائے جو اس کی ماں نے اس کی تربیت کے دوران کی اور اپنی بیٹی کی خود دیکھ بھال اور تربیت کرنے کی بجائے یہ ذمہ داری دوسروں کو سونپ دی۔ جس کی وجہ سے ایک لکیر سیدھی ہونے کی بجائے ٹیڑھی ہو گئی۔ شمن اپنی بیٹی کے لیے یہ ہی لکیر سیدھی کرے جو اس کی ماں نے زیادہ اولاد ہونے کی وجہ سے ٹیڑھی کر دی تھی وہ دوسری ماؤں کو بھی سبق دیتی ہے کہ اپنی بچیوں کے راستوں کو الجھنے کی بجائے سلجھائیں۔ ایک ماں اپنی بچیوں کو تنبیہ کرنے کی بجائے ان کی دوست اور رہنما بنے تاکہ وہ اپنی نفسیاتی، جذباتی اور معاشرتی زندگی کے مسائل کو ماں کے ساتھ زیر بحث لا سکے اور ان کا حل تلاش کیا جا سکے۔ اس ناول میں عصمت چغتائی کے انداز تحریر کو مشہور فرانسیسی فیمنسٹ سائمن دی بوار سے تشبیہ دی گئی۔ نسائی پس منظر میں لکھے گئے اس ناول میں بھی عورت کے مسائل کو بڑی روشن خیالی سے بیان کیا گیا ہے اور عورت کے ساتھ کیے جانے والے استحصالی رویے کی مزاحمت کی گئی ہے۔ اس ناول پر عصمت چغتائی کو غالب ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

اس ناول میں عصمت کا موضوع متوسط طبقے کی خواتین کے جنسی اور نفسیاتی مسائل سے ہے جن کو وہ بڑی بے باکی سے بیان کرتی ہے کیوں کہ اس کا اپنا تعلق بھی اسی طبقے سے ہے۔ ان کے خیال میں یہ طبقہ بڑا زندہ دل طبقہ ہوتا ہے نہ تو غریبوں کی طرح بھیڑ بکریاں بن کر ہر بات مانتا ہے اور نہ امیروں کی طرح بد تمیز ہے۔ اردو ادب میں ایسی بے باکی مردوں میں منٹو کے علاوہ کسی اور مرد نے نہیں دکھائی۔ وہ ایک مسلمان عورت ہو کر وہ تمام باتیں لکھ گئی جو مرد ادیبوں کے لیے لکھنا محال تھیں۔ جن مسائل پر عصمت چغتائی نے قلم اٹھایا لوگ ایسی باتیں سننا بھی پسند نہیں کرتے لکھنا تو دور کی بات ہے۔ عصمت چغتائی کا معاشرتی مشاہدہ بہت عمیق ہے وہ اکثر گھریلو عورت کی حالت زار پر آواز اٹھاتی ہے کیوں کہ جاگیر دارانہ نظام میں گھریلو عورت کو صرف گھر والوں کی اطاعت اور فرماں برداری سکھائی جاتی تھی جو اپنے سب فیصلے دوسروں کی خوشنودی کے لیے ان کی مرضی کے مطابق کرتی ہے۔ گھریلو عورت کی مجبوری کے تحت کی جانے والی اطاعت شعاری کو ناپسند کرتی ہے تاہم عصمت گھر کا ماحول پر سکون بننے پر زور دیتی ہے کیوں کہ انسان کہیں سے بھی آئے سکون اس کو گھر پر ہی ملتا ہے گھر سے باہر تو ہر انسان کی حیثیت مشین کی سی ہے۔ گھریلو

ماحول میں عورت کو چاروں طرف سے ڈارنے دھمکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جنسی اور صنفی ناہمواری کو نہ عصمت چغتائی خود مانتی ہے اور نہ کسی پر اس طرح ظلم کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ ایسی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں :

> ''میں دیکھتی ہوں کسی عورت کو اس کا شوہر شراب پی کر پیٹتا ہے، نو دس برس کی عمر کے بچے لوگوں کے پیچھے بھاگتے ہیں اور کہتے ہیں ٹیکسی چاہیے۔۔۔۔ لڑکی چاہیے۔۔۔۔ میں بھی پاس سے گزرتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ روزگار کے لیے اتنا چھوٹا بچہ عورت سپلائی کر رہا ہے وہ چاہے اس کی ماں ہو، اس کی بہن ہو، ان کے لیے کون۔۔۔۔۔ مجھے بڑا غصہ آتا ہے اس سماج پر جہاں خریدنے والے موجود ہیں اور بیچنے والے بھی۔'' (۱۱)

اس ناول میں عصمت چغتائی جدید اور روشن خیال عورت کے مسائل کو شمن کے کردار کے طور پر پیش کرتی ہے جس کا واسطہ زندگی میں مختلف مردوں سے پڑتا ہے جن میں سے جیون ساتھی کو منتخب کرنے کے لیے پرکھتی ہے گھریلو عورت کے کردار سے عصمت نالاں ہے جس کا سودا کرنے سے اس کے اپنے گھر والے دوست احباب بھی باز نہیں آتے۔ عام عورت کے علاوہ وہ طوائف کی حالت زار بہتر کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے کہ اگر وہ جسم فروشی کی بجائے محنت مزدوری کرلیں تو کم از کم معاشرے میں ان کی عزت تو ہو گی مگر محنت مزدوری والے کام میں معاوضہ کم ملتا ہے جس میں عیاش پسند طوائفوں کا گزارا مشکل سے ہوتا ہے۔ وہ عورتوں کے گھر کی چار دیواری میں قید ہونے کو پسند نہیں کرتی بلکہ وہ زندگی کو کامیاب بننے میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی شریک کرنے کی خواہاں ہیں، اس لیے وہ لکھتی ہیں :

> ''زندگی کی دوسری گاڑیوں کی طرح انقلاب کا چھکڑا بھی اکیلے بیل سے نہیں گھسٹتا صنف نازک کا وجود لازمی ہے۔ کوئی آزاد خود مختار عورت جو دنیا کی بکواس کا خیال نہ کرے۔'' (۱۲)

مرد کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے والی عورت پدرسری معاشرے کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتی اس کی آزادی اور خود مختاری کا راز اس میں ہی پنہاں ہے کہ وہ چادر اور چار دیواری کی غلامانہ زندگی کو

چھوڑ کر اپنے خاندان کے لیے ملازمت کرے مگر مردوں کی بنی ہوئی اس دنیا میں ہر اعلیٰ عہدے پر مرد ہی فائز ہے عورتوں کو ان کی قابلیت کے باوجود مردوں سے کم تر عہدے دیئے جاتے ہیں۔ یہ ہی طبقاتی ناہمواری معاشرتی ترقی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جس کو عبور کیے بغیر معاشرے کی فلاح و بہبود ممکن نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیراہن (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص۲۱۔

۲۔ فاطمہ حسن، فیمنزم اور ہم (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء)، ص۱۲۔

۳۔ عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر (لکھنو: واردات پبلشرز، ۱۹۹۰ء)، پیش لفظ۔

۴۔ ایضاً، ص۳۴۔

۵۔ ایضاً، ص۶۹۔

۶۔ ایضاً، ص۹۸۔

۷۔ ڈاکٹر یوسف مسرت، ''عصمت چغتائی کی ناول نگاری''، مشمولہ: عصمت چغتائی: شخصیت اور فن، مرتبہ: ایم سلطانہ بخش (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء)، ص۴۸۷۔

۸۔ عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر (لاہور: نیاادارہ، ۱۹۶۷ء)، ص۱۳۹۔

۹۔ ایضاً، ص۱۶۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص۳۳۷۔

۱۱۔ عصمت چغتائی، ''اکادمی کی ایک محفل میں'' (انٹرویو)، مشمولہ: ماہنامہ سیراز، سری نگر، جلد۳۰، شمارہ۸، ۱۰، ص۱۲۔

۱۲۔ عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر (لاہور: نیاادارہ، ۱۹۶۷ء)، ص۳۳۶۔